انتقادی مقالہ

ڈاکٹر محمد سلیم اختر ☆

عنوان کتاب	:	نصرت نامہ ترخان،
مصنف	:	سیّد میر محمد بن بایزید پورانی
تصحیح و تنقیح	:	ڈاکٹر انصار زاہد خان،
ناشر	:	انتشارات انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، جامعہ کراچی، کراچی،
سن طباعت	:	۲۰۰۰ء
صفحات	:	۴۹۶+۶۴، باتصاویر و شجرۂ نسب مصنف،
قیمت	:	۸۰۰/- روپے (پاکستان میں)، ۵۰ ڈالر (بیرون ملک)۔

امیر تیمور کا شمار بلاشبہ دنیا کے عظیم فاتحین میں ہوتا ہے۔ اسی کے دور اقتدار (۸۰۷-۷۷۱ھ/۱۴۰۴-۱۳۶۹ء) میں ماوراء النہر کے خطے کو عظمت و وقار کے ایسے چار چاند لگے کہ اس کی مثال تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ سمرقند ایک ایسی وسیع و عریض سلطنت کا پایۂ تخت قرار پایا جس کی حدود، نام ہی کو سہی، دہلی سے دمشق اور بحیرۂ خوارزم (Aral Sea) سے خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھیں،[۱] لیکن ایک تو تیمور کی فوجی مہمات میں ویسے ہی جہانداری کے مقابلے میں جہانگیری اور جہانکشائی پر زیادہ زور تھا، پھر اس کے طوفانی سلسلۂ فتوحات نے اُسے کبھی اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس قدر عظیم سلطنت کے انتظام و انصرام کا کوئی خاطر خواہ اور باقاعدہ نظام وضع کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُدھر

☆ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، اسلام آباد

اس کی آنکھیں بند ہوئیں، اور اِدھر اس کے جانشینوں کی اپنے آبائی مقبوضات پر گرفت نرم پڑنے لگی۔(۲) شاہرخ میرزا ابن تیمور (۵۰-۸۰۷ھ/۴۷-۱۴۰۴ء) نے فروپاشی کے اس عمل کو بڑی حد تک روکے رکھا لیکن سلطان ابو سعید میرزا (۷۳-۸۵۵ھ/۶۹-۱۴۵۱ء) کے شہید ہوتے ہی اس کے جانشینوں کی باہمی رقابتیں اور خانہ جنگیاں اپنے عروج کو پہنچ گئیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تیمور کی عظیم الجثہ سلطنت بمرورِ ایام اپنے اصلی وجود کا سایہ بن کے رہ گئی۔ اس سے ایک طرف تو ایران میں صفوی خاندان کے عروج، ماوراء النہر میں اوزبکوں کے اقتدار، اور خراسان میں ابو الغازی سلطان حسین میرزا بایقرا کی عظیم علم دوست ریاست کی تاسیس و تحکیم کی راہیں کھل گئیں، تو دوسری طرف سلطان ابو سعید میرزا کے پوتے بابر نے ماوراء النہر اور کابل میں پے درپے مایوسیاں اُٹھانے کے بعد برصغیر جنوبی ایشیا میں اپنے موروثی مقبوضات کی بازیابی کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا۔ بابر کی یہی سوچ بالآخر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاگذاری کا باعث بنی۔

ماوراء النہر، افغانستان، اور خراسان کے اس سیاسی خلفشار اور انتظامی عدمِ استحکام کی تسریع میں جہاں اور بہت سے عوامل بھی کارفرما تھے وہاں منگول نسل ہی کے مہم جو اور جری ارغون اور ترخان قبائل کی ریشہ دوانیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قبائل یوں تو تیمور کے زمانے ہی سے اس کی عسکری مہمات میں ایک نمایاں کردار ادا کرتے چلے آ رہے تھے لیکن تیمور کے جانشینوں کی کمزوریوں کو دیکھ کر وہ بساطِ اقتدار پر براہِ راست اثر انداز ہونے کے لیے بھی پر تولنے لگے۔ ابتدا میں تو یہ جماعت خود تیموری شہزادوں ہی کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کر کے اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کرتی رہی لیکن پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ بادشاہ گری کے بجائے خود بادشاہ بننے کی خواہش ان کے دلوں میں مچلنے لگی، لیکن ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کی مقتدر حکومت، ماوراء النہر میں شیبانی خان کے زیر نگرانی اوزبک احیائے اقتدار، کابل پر بابر کی مضبوط گرفت، ہرات میں ابوالغازی شاہ سلطان حسین میرزا بایقرا کی موجودگی، اور سندھ میں سمہ خاندان کے عالی دماغ، علم پرور، انسان دوست اور ہر دلعزیز حکمران جام نظام الدین نندہ (۹۱۴-۸۶۶ھ/۱۵۰۸-۱۴۶۱ء) کی مستحکم

حکومت کے ہوتے ہوئے ان کی اس آرزو کا تحقق کوئی آسان بات نہ تھی۔

سلطان ابو سعید کی تخت نشینی میں ارغونوں نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔(۳) چنانچہ اس کے اقتدار میں آنے سے ان کے اثر و رسوخ میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ سندھ میں ارغون سلطنت کے مورث اعلیٰ امیر ذوالنون بیگ ارغون نے بھی اپنی عملی زندگی کا آغاز سلطان ابو سعید ہی کے دربار سے کیا تھا، جہاں اس نے اپنی بے مثال جرأت اور دلیری سے جلد ہی سلطان کا دل جیت لیا۔ ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء میں سلطان کی شہادت پر ذوالنون نے پہلے ھرات آکر سلطان حسین میرزا بایقرا کی ملازمت اختیار کی لیکن پھر جلد ہی واپس سمرقند جا کر اپنے متعلقین سمیت بابر کے چچا سلطان احمد میرزا (۹۹-۸۷۳ھ/۹۴-۱۴۶۹ء) کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ جب وہاں بھی دل نہ لگا تو امیر ذوالنون دو تین سال بعد واپس سلطان حسین بایقرا کے پاس چلا آیا، جہاں اس نے ایک طرف بایقرا کی سلطنت کی توسیع و استحکام کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں، وہاں قندہار، سیدی اور شال (موجودہ کوئٹہ) جیسے سوق الجیشی اہمیت کے مقامات پر اپنے پاؤں جما کر، دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل کے دوران سندھ میں (جو اس سے قبل ۸۹۲ ہجری/۱۴۸۷عیسوی میں بھی ہرات کی تیموری سلطنت کی ہوس ملک گیری کا نشانہ بن چکا تھا)، اپنے جانشینوں کے ہاتھوں، یکے بعد دیگرے خود مختار ارغون اور ترخان سلطنتوں کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔(۴) اس طرح مجموعی طور پر خطۂ سندھ کوئی ایک سو برس تک براہ راست تمام کمال ارغون اور ترخان خاندان کے حیطۂ تصرف میں رہا، جس میں سے کوئی تین چوتھائی صدی تک-- وقتاً فوقتاً کے سخت مغل دباؤ کے باوجود وہ کم و بیش مستقل ہی تھے، باقی ربع قرن کا عرصہ انہوں نے مغلوں کے باجگزار بن کر گزارا، اور پھر ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں میرزا غازی بیگ ترخان کی وفات پر بعہد جہانگیری یہ منطقہ برصغیر کی مغلیہ سلطنت کا ایک باقاعدہ صوبہ بن گیا، اور اس کی یہ حیثیت ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء میں مغل بادشاہ محمد شاہ (۶۱-۱۱۳۱ھ/۴۸-۱۷۳۹ء) کی نادر شاہ افشار کے ہاتھوں شکست تک برقرار رہی۔(۵)

سندھ پر ارغون اور ترخان تصرف کے حوالے سے حال ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، جامعہ کراچی، نے نصرت نامۂ ترخان کے نام سے دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کا ایک فارسی متن ڈاکٹر انصار زاہد خان کے انگریزی مقدمے، تحقیق، اور تعلیقات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر انصار زاہد خان برصغیر۔ جنوبی ایشیا کی قرونِ وسطی کی تاریخ، سندھ، اور برصغیر کی تحریک آزادی کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ آپ کی کئی کتابیں اور مقالے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ آپ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری اور ڈائریکٹر ریسرچ ہونے کے علاوہ اسی ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے سہ ماہی تحقیقی مجلے، جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے مدیر اعلیٰ، اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے فصلنامے ہمدرد اسلامیکس کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر بھی ہیں۔[6] اس کے علاوہ، آپ کو مرحوم ڈاکٹر معین الحق اور حکیم محمد سعید شہید کے ساتھ بعض آثار کی تصنیف/ تالیف اور تصحیح کا کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔

جہاں تک نصرت نامۂ ترخان کی ایک تاریخی دستاویز کے طور پر اہمیت کا تعلق ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سندھ و ھند، خراسان، ایران، افغانستان، اور ماوراء النہر کے نویں صدی کے اواخر اور دسویں صدی ہجری کے اوائل کے اہم ترین تحولات پر یہ ایک چشم دید مفصل تبصرہ ہے جو اس دور کی ہندی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر کسی نہ کسی طرح بیش قیمت اضافہ کرتا ہے، جسکی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کتاب ہذا کا نہ صرف مصنف ارغون اور ترخان حکمرانوں کے ساتھ ذاتی تعلقات رکھتا تھا، بلکہ اس کے آباؤ اجداد گزشتہ نصف صدی سے متذکرہ بالا تمام علاقوں کے ارباب اقتدار کی عقیدت و احترام کا مرکز تھے،[7] اور اسے اور اس کے قریبی افراد خاندان کو (جن کے پس ماندگان آج بھی سندھ میں بکثرت موجود ہیں)، بے شمار ایسی شخصیات اور مدارک[8] تک دسترس حاصل تھی جنہوں نے معاصر حالات و واقعات کی تشکیل میں کوئی نہ کوئی اہم کردار ادا کیا تھا۔

''نصرت نامۂ ترخان'' کا ابتک کا معلومہ تنہا نسخہ ۲۵ رفروری ۱۹۵۰ء کولٹن لائبریری، علی گڑھ یونیورسٹی (بھارت) میں بشمارۂ ۱۴۶ (اخبار فارسیہ کلکشن) ثبت ہوا، اور آج سے کوئی ایک ربع قرن پیشتر معروف جرمن اسکالر ڈاکٹر این میری شمل کے نوٹس میں آیا، جنھوں نے اس کی ایک فوٹو کاپی رمائیکروفلم مرحوم پیر سید حسام الدین راشدی کے لیے حاصل کی۔ پیر صاحب کے زیر نگرانی اسے بغرض تحقیق و تدقیق کراچی میں نقل کرایا گیا، اور پھر اس نقل کو علی گڑھ بھیج کر، معروف دانشور جناب پروفیسر خورشید الاسلام کی وساطت سے اسی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ایک معلم جناب ابوالہاشم کے ذریعے اصل قلمی نسخے کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کرایا گیا، جنھوں نے نہ صرف قلم افتادہ اور فلم میں ظاہر نہ ہونے والی عبارات کا اس نقل میں اضافہ کیا، بلکہ اپنی طرف سے بعض یادداشتیں بھی مقابلہ شدہ نقل کے ہمراہ کراچی بھیجیں۔ اسی نقل مطابق اصل کو پیر صاحب نے اپنی آخری جان لیوا علالت کے دوران سرسری نظر دیکھ کر غالباً ۱۹۸۰ء کے اوائل میں[۹] ڈاکٹر انصار زاہد خان کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، جامعہ کراچی، کے زیر اہتمام اشاعت کے لیے تیار کریں، جسے اس ادارے نے ۲۰۰۰ء کے دوران شائع کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کو، ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب نے، اپنے پیش لفظ میں بجا طور پر پاکستان اور سینٹرل ایشیا کی ہسٹوریوگرافی کا ایک ''اہم واقعہ'' قرار دیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے لیے اہل علم کو گویا کوئی پچیس برس تک انتظار کرنا پڑا۔

کتاب عمدہ کاغذ پر چھپی ہے اور اس کی صحافی کا معیار اعلیٰ ہے۔ اس کا سائز ۲۰×۳۰/۸ اور صفحات کی تعداد ۵۸۲ ہے۔ دائیں طرف فارسی متن ہے جو ۴۳۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد، ۴۳۸ سے ۴۹۳ کے صفحات ''(کذا) Geographical&Historical Note''، اور ۴۹۴ تا ۴۹۶ کے صفحات کتابیات کے لیے مختص ہیں۔ کتاب کے بائیں جانب سب سے پہلے پروفیسر ریاض الاسلام صاحب کا پیش لفظ ہے جس کے بعد چونسٹھ صفحات پر (جن میں سے ص ۵۴ تا ۶۴ تک مقدمہ کے حواشی و منابع ہیں) محیط ڈاکٹر انصار زاہد خان کا مقدمہ ہے۔ فارسی متن اور اسکی تعلیقات

و کتابیات کے ۴۹۶ صفحات، اور بائیں جانب کے صفحہ ۶۴ کے درمیان دس صفحے ایسے ہیں جن پر کوئی نمبر نہیں۔ ان میں سے بائیں طرف سے پہلے چار صفحوں پر مصنف کے خاندانی قبرستان اور بعض قبروں کی کل سات رنگین تصویریں ہیں جن میں سے ہر ایک کا عنوان اس کے نیچے درج ہے۔ اس کے بعد ساداتِ پورانی کا ایک صفحے کا شجرۂ نسب ہے، اور اس کے بعد دو قلمی نسخوں سے مأخوذ پانچ صفحات کے سیاہ و سفید عکس ہیں جن کے بارے میں قاری کی رہنمائی کا کوئی بندوبست نہیں۔ ان میں سے دائیں جانب کے پہلے تین عکس، نصرت نامہ ترخان، کے قلمی نسخے کے ہیں، جبکہ باقی دو صفحات کے داخلی قرائن سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ ''نورالدین بن ابی سعید البورانی'' کی کسی تصنیف سے متعلق ہیں، اور اس موخرالذکر اصل کتاب کا قلمی نسخہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی (اب اسلام آباد) میں محفوظ ہے۔

فارسی متن پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے متون کی تصحیح و تنقیح تو رہی درکنار، ان کو درست پڑھ لینا بھی، فارسی زبان کی شدبد رکھنے والے ہر شخص کا کام نہیں، چہ جائیکہ نسخہ بھی ایک ہی ہو، اور اس کو نقل کرنے والا شخص بھی نیم خواندہ! داخلی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ کاتب نے یہ نسخہ غالباً دیکھ کر نقل نہیں کیا، بلکہ اُسے اِملا کرایا گیا ہے، اور پھر اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کے نسخۂ مادر کے ساتھ مقابلے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کا اسلوبِ بیان مصنوع و مرصّع ہے جس کے سمجھنے کے لیے ایک خاص حد تک کی فارسی متون کے مطالعے کی ممارست ضروری، بلکہ ناگزیر تھی۔ یہ درست ہے کہ کسی منحصر بفرد نسخے کی تصحیح میں بہت ساری غیر معمولی دشواریاں پیش آتی ہیں لیکن اسے کیا کہیے کہ کتاب ہٰذا کے مطبوعہ فارسی متن میں، بشمول جلی حروف میں چھپے ہوئے عناوین کے، بلا مبالغہ سینکڑوں ایسے الفاظ موجود ہیں جنھیں عبارت کے سیاق و سباق، اور اس میں موجود لفظی و معنوی قرینوں کی مدد سے، یا بعض حروف و الفاظ کی نشست کو ذرا دائیں یا بائیں جانب سرکا کے، یا ان کے نقطوں میں کمی بیشی کر کے، درست کیا جا سکتا تھا، لیکن نہیں کیا گیا!

ایک اور انتہائی اہم نکتہ جس کا اطلاق پوری کتاب پر ہوتا ہے اور جس کی طرف شاید آئندہ بھی اشارہ کرنا پڑے، کتاب کی طباعت کے تکنیکی پہلوؤں کی طرف توجہ کا مکمل فقدان ہے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر--- بعض فنی اسقام کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح فارسی متن کے عناوین جو بسا اوقات تین تین چار چار سطور پر پھیلے ہوئے ہیں، انہیں ہر جگہ ایک پیرے کے انداز میں کمپوز کر دیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کئی مقامات پر تو بعض الفاظ کو اس قدر بے رحمی(!) کے ساتھ دو سطروں میں منقسم کر دیا گیا کہ وہ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔[۱۰]

مصروفیت اور گہماگہمی کے اس دور میں کسی علمی کتاب کی فہرستِ اعلام کے بغیر اشاعت کا تصور کرنا بھی محال ہے، بلکہ بعض مصنفین تو اپنے قارئین کی عدیم الفرصتی کا اس حد تک لحاظ کرتے ہیں کہ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر اشخاص، اماکن، کتب و رسائل، آیات قرآن، احادیث نبوی، اور اہم موضوعات وغیرہ تک کی الگ الگ فہارس ان کے آثار کے آخر میں موجود ہوتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نصرت نامہ ترخان کے آخر میں نہ تو کوئی انڈکس موجود ہے اور نہ ہی اس کے آغاز میں ۴۳۷ صفحات پر پھیلے ہوئے متن کی، جس میں بیسیوں ابواب شامل ہیں، کسی فہرستِ مطالب کا اضافہ کرنا مناسب سمجھا گیا ہے۔

متن کے حوالے سے چند ایک اور باتیں جن کا ذکر یہاں اشد ضروری ہے، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ فارسی متن میں جہاں کہیں کوئی لفظ مبہم محسوس ہوا ہے مصحح محترم نے کہیں اس کے آگے [sic][۱۱] ، کہیں [کذا]،[۱۲] اور کہیں اسی کے آگے بریکٹس میں (اپنے زعم کے مطابق) اس کے درست نعم البدل کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔[۱۳] اس کے علاوہ ایک اور صورت یہ بھی نظر آتی ہے کہ 'صحیح' لفظ متن میں شامل کر دیا گیا ہے اور اس پر نشان یا نمبر لگا کر فٹ نوٹ میں بتا دیا ہے کہ قلمی نسخے میں اس لفظ کا املا یہ تھا۔[۱۴] اس کے باوجود کتاب میں بے شمار الفاظ ایسے نظر آئیں گے جو پکار پکار کر اپنے غلط ہونے کا اعلان کر رہے ہیں، لیکن فاضل ''مصحح'' نے وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے ان کی اس

جسارت سے اغماض کر لیا ہے! یہاں جو بات بہرحال انتہائی باعث تشویش ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم کتاب کے انگریزی مقدمے میں منقول نصرت نامہ ترخان کے اقتباسات کا مقابلہ خود مطبوعہ متن کے ساتھ کرتے ہیں تو دونوں میں کم و بیش ہر جگہ متعدد اختلافات نظر آتے ہیں جن کا کوئی سبب کسی جگہ، مقدمے میں یا حواشی متن میں، منعکس نہیں ہوا۔ اندریں صورت ان اختلافات کو کس بات پر محمول کیا جائے؟ جب تک اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب سامنے نہ آئے، کیا مطبوعہ متن کے مطابق بہ اصل ہونے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

دوسری بات یہ کہ متون کی تصحیح کے دوران جہاں جہاں نسخۂ اساس کا ورق نمبر بدلتا ہے، بالعموم عبارات کے درمیان میں، یا نشان لگا کر حاشیے یا فٹ نوٹ میں اگلے ورق/فولیو کا نمبر بہ اضافۂ a/b یا ا/ب (سامنے اور پشت کے پرت کے مابین امتیاز کی خاطر) کر دیا جاتا ہے۔ مطبوعہ متن میں بریکٹس کے درمیان فولیو نمبرز تو مذکور ہیں لیکن ان کے ساتھ متعلقہ اوراق کے دونوں پرتوں کے درمیان امتیاز کا کوئی اہتمام نظر نہیں آتا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ کتاب ہذا کا سارے کا سارا قلمی نسخہ اوراق کے ایک ہی جانب لکھا ہوا ہے، جن کے پچھلے پرت خالی ہیں؟۔

تیسری بات یہ کہ نصرت نامۂ ترخان کے فارسی متن کی طباعت کے لیے تیاری کے دوران اس کے فولیوز ۲۴-۴۷ کو (جن کے اندر شامل ابواب کے عناوین مطبوعہ کتاب کے ص ۲۷ پر ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں)، مصحح فاضل نے جگہ کی قلت اور اس خیال سے کہ ان کے مندرجات--مصنف کے بقول--تذہر الابرار [تذکار--؟]، نفایس الفنون، جامع المعارف (؟)، ظفر نامۂ یزدی اور جوش و خروش (؟) پر مبنی تھے، موجودہ اشاعت میں شامل نہیں کیے۔[۱۵] احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ مصنف کی فراست پر اعتماد کرتے ہوئے پوری کتاب کو جوں کا توں شائع کر دیا جاتا، اس سے ایک تو سرحد پار سے آئی ہوئی کتاب کی اس نقل کی سالمیت برقرار رہتی، اور دوسرے دلچسپی رکھنے والے قارئین اس سے حسب ضرورت استفادہ کر سکتے اور اگر بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ایسا بڑا فیصلہ کرنا ہی پڑتا تو اس بات کا تو کم از کم اطمینان کر لیا جاتا کہ مذکورہ بالا پانچ مآخذ اب موجود بھی ہیں یا

نہیں، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ خود مصحح کو بھی ان پانچ میں سے تین کتابوں کے مصنفین تک کے نام معلوم نہیں۔ اور ظفر نامۂ یزدی (جس کے مصنف کو ہم جانتے ہیں)، اس کی تین اشاعتوں میں سے دو میں وہ مقدمہ شامل ہی نہیں[۱۶] جس سے نصرت نامہ ترخان کے مصنف نے اتراک کے حالات کے سلسلے میں استفادہ کیا تھا۔

دراصل بات یہ ہے کہ مصنف نے ارغونوں اور ترخانوں کی تاریخ ان کے ابو الآباء یافث بن نوح سے شروع کی تھی، اور اس ضمن میں ظاہراً۔ ظفر نامۂ یزدی کی طرز پر[۱۷] ان کے مختلف قبائل کی تشکیل، وجہ تسمیہ اور نشوونما پر بھی روشنی ڈالی ہوگی۔ اس سلسلے میں اس نے جہاں ظفر نامہ کو سامنے رکھا وہاں اس سے بھی پہلے دور کی ایک مثنوی جوش و خروش سے بھی استفادہ کیا۔ یہ مثنوی جو بنیادی طور پر امیر تیمور کے ''مآثر و مفاخر'' کے بیان میں تھی، ظاہراً اس میں موصوف کے آباؤاجداد کا بھی ذکر آیا ہوگا۔ اس کا مصنف شیخ محمود زنگی عجم ۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء کے لگ بھگ جب امیر تیمور قلعۂ گرجستان کے خلاف لشکرکشی کر رہا تھا، اس کے حضور پیش ہوا لیکن واپسی پر تفلیس میں دریائے کُر میں ڈوب کر مرگیا۔ شیخ محمود کی اس طرح ناگہانی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کے بیٹے شیخ قطب الدین نے جوش و خروش کا ایک ''ذیل'' لکھ کر تیمور کی خدمت میں پیش کیا تو بقول شیخ شرف الدین یزدی ''عاطفتِ پادشاہانہ شامل حال او شد و اَلمِ جراحتِ ماتمش را بمراہمِ مراحمِ بیکرانہ تسکین بخشید''[۱۸] اس سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ متذکرہ بالا اوراق کو شاملِ اشاعت نہ کرنا کوئی دانشمندانہ اقدام نہ تھا۔

آیئے، اب آتے ہیں مقدمۂ مصحح اور تعلیقات کی طرف۔ مقدمے میں مصحح کی توجہ کا مرکز زیادہ تر پہلے سے معلوم سیاسی تحولات اور واقعات ہی رہے ہیں، اور جہاں کہیں کسی تازہ نکتے کی بدولت تاریخ سندھ کا کوئی نیا گوشہ واضح ہونے کا امکان تھا، عبارات کی بھول بھلیّوں نے انہیں اس کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اس کے باوجود انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نصرت نامۂ ترخان کے مطالعے کے لیے ایک مفید اور کارآمد پس

منظر کا حکم رکھتا ہے۔ خاص طور پر پورانی سادات کے بارے میں ان کی فراہم کردہ معلومات نصرت نامۂ ترخان کے علاوہ ان کی طرف سے قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہیں۔ مرحوم پیر حسام الدین راشدی کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اس موضوع پر خود قلم اٹھائیں لیکن زندگی نے ان سے وفا نہ کی۔ ڈاکٹر انصار زاہد خان کے اس اقدام سے ان کی روح کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔ تاہم یہ بات بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہی ہے کہ مصحح فاضل کی تمام تر محنت اور جانفشانی کے باوصف جو کچھ مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے ہے وہ تحقیق و تدقیق کے مسلمہ معیار پر پورا نہیں اترتا۔

انگریزی مقدمہ میں بعض جگہوں پر بین السطور جو حوالے دیے گئے ہیں وہ درست نہیں۔ یعنی ان حوالوں کی مدد سے جب ہم مقدمہ کے آخر میں مندرج متعلقہ مآخذ سے رجوع کرتے ہیں تو ان کے مذکورہ صفحات پر وہ مطالب ناپید ہیں۔[۱۹] بعض جگہوں پر جہاں حوالے درست بھی ہیں جب مقدمہ کی عبارت کا متعلقہ مآخذ میں موجود معلومات سے موازنہ کرتے ہیں تو اس میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً مقدمہ کے پیرا ۱، سطر ۶ میں جہاں "تیرہ" مرقوم ہے حبیب السیر میں اسی جگہ کا درست اور مکمل نام "قلعہ تیرۂ نو" ضبط ہوا ہے۔[۲۰] اسی قسم کی ایک اور مثال مرزا شاہ حسن ارغون کی بیٹی چوچک بیگم کے اصلی نام کی ہے۔ وہ بالعموم اسی موخر الذکر نام ہی سے معروف ہے، لیکن نصرت نامہ ترخان کے مصنف نے پہلی دفعہ اس کا اصلی نام "سلمہ سلطان بیگم" نقل کیا ہے، ڈاکٹر انصار زاہد خان نے تعلیقات میں اسے "سلطان بیگم" بنا دیا ہے۔[۲۱] ایسی ہی متعدد اشتباہات دوسری مطبوعہ کتابوں سے مطالب کو نقل کرنے میں بھی جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ گویا جو چیزیں اصل منابع میں اپنی جگہ پر درست تھیں، نصرت نامہ ترخان میں نقل کرتے وقت ان کو بھی غلط یا مشتبہ بنا دیا گیا ہے۔[۲۲] اس کے علاوہ مقدمہ، اور تعلیقات میں ایسے موارد بھی ملتے ہیں جہاں فاضل مصحح کو مصنف کی فارسی عبارات کے مفہوم کو سمجھنے میں تسامح ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال تو ص ۲۹-۲۷ پر شیخ جلال الدین ابو یزید پورانی اور شیخ جلال الدین، ابو سعید

پورانی کی شخصیات کے بارے میں موجود خلطِ مبحث ہے۔ اسی قسم کی کچھ صورت حال ص ۵ کے آخری پیراگراف میں بھی نظر آتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ص ۳۲ پر ڈاکٹر انصار زاہد خان نے لکھا ہے کہ شیخ جلال الدین ابو سعید پورانی جب زندگی کے آخری ایام میں قریہ ماشور میں بیماری کے باعث صاحب فراش تھے، تو انہی دنوں بابر کی طرف سے قندہار پر چڑھائی کی افواہ بھی گرم تھی، جس کے پیش نظر شیخ کے بہی خواہوں اور اہلِ خانہ نے کئی دفعہ ان کو ماشور سے نقلِ مکانی کا مشورہ دیا لیکن آپ بدستور وہیں پر مقیم رہے، تا آنکہ آپ کا وہیں پر انتقال ہوگیا۔ اصل بات یہ ہے کہ شیخ جلال الدین ابو سعید پورانی کو بابر سے کوئی خطرہ نہیں تھا وہ تو خود ان کا ارادت مند تھا۔ خطرہ تھا تو شاہ بیگ ارغون کی ذات کو، جو شیخ کی تیمارداری کی غرض سے ماشور میں رکا ہوا تھا اور جب شیخ کا اسی بیماری کے دوران انتقال ہوگیا تو ان کے تابوت کے اگلے دو پایوں کو شاہ بیگ اور مرزا کیخسرو نے، اور پچھلے دو پایوں کو ''عالی جاہ ممالک پناہ زینکہ ترخان'' اور ''عالی جاہ مملکت پناہ امیر بابا بیگ'' نے تھما کندھا دیا اور اسے اس احترام کے ساتھ قندہار شہر کے اندر لے جا کر بعض لوگوں کی بیماری کے شیوع کے خطرے کے پیشِ نظر مخالفت کے باوجود آپ کو وہاں دفن کیا اور مقبرہ تعمیر کیا۔ بابر کی آمد کے خطرے کے باعث ماشور اور قندھار سے دوری اختیار کرنے کا مشورہ شاہ بیگ ارغون کو دیا گیا تھا، جو شیخ کے ساتھ اپنی غیر معمولی قلبی وابستگی کے باعث اس نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔

فارسی متن کے ص ۳۳۳ پر مصنف نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ فردوسی نے شاہنامے کی تالیف میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا، اس کی بیہودگی کا اسے بعد میں احساس ہو گیا تھا اور اس نے اس بات کا اقرار حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ نظم کرتے وقت خود بھی کیا ہے، اور اس کے بعد مصنف نے فردوسی سے (غلط طور پر) منسوب(۴۳) مثنوی یوسف و زلیخا کے بعض اشعار بھی اپنے بیان کی تائید میں نقل کیے ہیں۔ اس پر کتاب کی تعلیقات میں ڈاکٹر انصار زاہد خان کا یہ تبصرہ محلِ نظر ہے:(۴۴)

"The episode of Prophet Yusuf (Joseph A.S.) is not found in the Shah namah."

اماکن ہوں یا اشخاص، کتابوں کے نام ہوں یا عام بول چال کے الفاظ اور اصطلاحات، فاضل مصحح نے ان کے درست تلفظ اور املاء کی طرف بھی قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔ مثلاً Farah کو Farah ، Garmsir کو Garamsir، Quhistan کو Qahistan، Quhistani کو Qahistani، Uymaq کو U'imaq، Amuli کو Amali ، Shiqqdar کو Shiqdar، Ghujdawan کو Ghazdawan، Nafahat کو Nafhat ، Murwarid کو Marwarid، اور Gurkan کو Gurgan بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح طباعت کی احتمالی غلطیاں اپنی جگہ، بعض انگریزی الفاظ کے بھی غلط العوام قسم کے تلفظ اور ہجے کتاب میں استعمال ہوئے ہیں، مثلاً Foolseap کے بجائے full-scape، emigre's کے بجائے emigrees، Litterateur کے بجائے Litterature اور نامعلوم کیوں Peace be Upon Him کے دعائیہ جملے کا مخفف (P.B.U.H) کے بجائے ہر جگہ (P.B.H) ہی لکھا گیا ہے۔

کسی تحقیقی و علمی کتاب پر نظر پڑتے ہی قاری کی توجہ سب سے پہلے اس کے دیباچے/ مقدمے کی طرف، اور پھر اس کی کتابیات یا ببلیوگرافی کی طرف جاتی ہے، جس کے مرتب کرنے کا ایک بین الاقوامی اسلوب اور سلیقہ ہے، اور جس کی کم و بیش ہر جگہ پابندی کی جاتی ہے۔ ''کتابیات'' میں کسی بھی کتاب کے مشخصات بالعموم اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں۔ مصنف/مرتب کا نام، کتاب کا عنوان، محلِ اشاعت، اور سالِ اشاعت۔ نصرت نامۂ ترخان کو جب میں نے پہلی دفعہ کھولا تو ص ۴۹۶ پر اس کی انگریزی کتابوں کی ببلیوگرافی میں کتابوں کے محلہای اشاعت کا ذکر ان کے سنین اشاعت کے بعد دیکھ کر ذرا سی دیر کے لیے تو میں ٹھٹھک گیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ڈاکٹر انصار زاہد خان کتابیات کی ترتیب میں اس قسم کی جدّت کا اظہار اپنی اس سے پہلے کی ایک کتاب میں بھی کر چکے ہیں،[۲۵] میں نے اسے ان کی ذاتی پسند اور صوابدید سمجھ کر نظرانداز کر دیا، لیکن جب میں اس ببلیوگرافی کے آغاز کی طرف لوٹا تو معلوم ہوا کہ نہیں، ایسا نہیں، بعض کتابوں کے مشخصات انہوں نے بین الاقوامی طور پر طے شدہ متفق الیہ طریقے سے بھی نقل کیے ہیں۔

بلیوگرافی کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس میں ان تمام کتابوں کے نام شامل نہیں، جن سے حضرت مصحح نے مقدمہ یا تعلیقات یا ''تصحیح متن'' کے سلسلے میں استفادہ کیا ہے۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کے نام اس حد تک مسخ ہو گئے ہیں کہ شاید ان کے مصنف بھی ان کو نہ پہچان سکیں، منجملہ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم کی جگہ صرف Mufahris al-Mu'jam کے الفاظ لکھ دیے گئے ہیں۔(۲۶) بہت سے مصنفین کے ناموں کے ابتدائی اختصارات (Initials) غائب ہیں، بعض کے ناموں کے ہجے درست نہیں، مثلاً Badr کو Badar، Browne کو Brown، Denison کو Denizen، Ishtiaq Husain (Qureshi) کو Istiaque Husan Qureshi، اور Jauhar Aftabchi کو Jawahar Aftabchi بنا دیا گیا ہے۔ بعض کتب کی جائے اشاعت، بعض کے سال اشاعت، اور بعض کے بارے میں دونوں کا ذکر نہیں۔ بعض کے محلِ انتشار غلط ہیں، قانع تتوی کی کتاب ''معیار سالکانِ طریقت'' سب سے پہلے کسی یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے طور پر منظرِ عام پر آئی۔ یہ تحقیقی مقالہ کس یونیورسٹی میں، اور کس سال پیش کیا گیا، اس بارے میں کتابیات بالکل خاموش ہیں۔ اس کے علاوہ کبھی ایک ہی مصنف کا نام اس کے دو مختلف اجزاء کی بناء پر کتابیات میں دو دفعہ دے دیا گیا ہے، اور کبھی ایک ہی مصنف کی ایک سے زیادہ کتابیں ایک ہی جگہ پر یکے بعد دیگرے اس کے نام کے بعد درج کر دی گئی ہیں۔

مختصر یہ کہ نصرت نامۂ ترخان ایک بڑی ہی وقیع کتاب ہے اور بلاشبہ یہ اس سے کہیں بہتر سلوک کی مستحق تھی جو اس کے ''مصحح'' نے اس کے ساتھ روا رکھا ہے۔ بہرحال ان سب باتوں کے باوجود یہ جن لوگوں کی مساعی کے نتیجے میں آج ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہے، اُن کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

مریزاد دستی کہ مربی دلان را
دوای دل و مرہم جان فرستد!

حواشی

۱۔ Stanley Lane-Poole, The Mohammadan Dynasties, Beirut, 1966, p.266.

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۳۔ دولت شاہ سمرقندی، تذکرۃ الشعراء، باہتمام محمد عباسی، تہران، ب-ت، ص ۴۰۶

۴۔ Muhammad Saleem Akhtar, Sind Under the Mughuls, Islamabad/Karachi, 1990, pp.5-15

۵۔ ایضاً، ص ۴

۶۔ سید میر محمد بن بایزید پورانی، نصرت نامۂ ترخان، تصحیح و تنقیح (؟) ڈاکٹر انصار زاہد خان، کراچی، ۲۰۰۰ء، گرد پوش

۷۔ ایضاً، ص ۲۳

۸۔ مثلاً نکہ: متن فارسی، ص ۳۰

۹۔ ایضاً، مقدمۂ مصحح، ص ۱۷-۱۶

۱۰۔ مثال کے طور پر دیکھیے: فارسی متن کے ص ۲۹۲ پر مذکور عنوان

۱۱۔ مثلاً دیکھیے: فارسی متن، ص ۲۰، س۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵، س ۱۵: ص ۱۹، س ۱۹: ص ۲۴، س ۸: ص ۲۵، س ۴ وغیرہ وغیرہ

۱۳۔ مثال کے طور پر دیکھیے: ص ۲۷، س ۲

۱۴۔ اس کی مثالیں اکثر صفحات کے فٹ نوٹس میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں، جن میں سے بعض مضحکہ خیز حد تک نا درست ہیں۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۶۔ شرف الدین علی یزدی، ظفر نامہ، بہ تصحیح، اہتمام محمد عباسی، تہران، ۱۳۳۶ شمسی (دو جلد)، و شرف الدین علی یزدی، ظفر نامہ، بہ تصحیح مولوی محمد الہ داد، کلکتہ، ۸۸-۱۸۸۵ء، بحوالہ C.A.Storey, Persian Literature: a bio-bibliographical survey, London, 1927-39, Vol.1, Part 1, p.286.

۱۷۔ ملاحظہ ہو: شرف الدین علی یزدی، ظفر نامہ، تمہید و تنظیم از عصام الدین اور و نبایوف، تاشکند، ۱۹۷۲ء، ص ۵۷ (مقدمہ)

۱۸۔ حوالہ سابق، ص ۸۹۸

۱۹۔ مثلاً ملاحظہ ہوں فٹ نوٹس ۶، ۷ اور ۸ مذکور در ص ۳ (مقدمہ مصحح)

۲۰۔ دیکھیے: خواند امیر، تاریخ حبیب السیر، پ پ سوم، تہران، ۱۳۶۲شمسی، جلد چہارم، ص ۱۰۱

۲۱۔ ملاحظہ ہو: فارسی متن، ص ۳۵۳ اور تعلیقات ص ۴۸۵، نمبر ۲۷۲

۲۲۔ مثال کے طور پر دیکھیے: نصرت نامہ ترخان، ص ۴۵۵
اشعار منقول از سلطان محمد فخری بن محمد امین ہروی، تذکرۂ روضۃ السلاطین، تصحیح و تحشیہ سید حسام الدین راشدی، حیدر آباد، ۱۹۶۸ء، ص ۴۶

۲۳۔ ملاحظہ ہو: ھرمان اتہ، تاریخِ ادبیاتِ فارسی، ترجمہ با حواشی رضا زادہ شفق، تہران، ۱۳۳۷شمسی، ص ۴۹، حاشیہ نمبر۱، اور **Jan Rypka, History of Iranian Literature, ed. Kark Jahn, Dordrecht-Holland, 1968, p.155.**

۲۴۔ نصرت نامہ ترخان، تعلیقات، ص ۴۸۰، نمبر ۲۵۱

۲۵۔ **Ansar Zahid Khan, History and Culture of Sindh, Karachi, 1980, pp.360-69**

۲۶۔ اسی طرح نصرت نامہ ترخان، ص ۴۶۲، نمبر ۱۳۶، میں آقا بزرگ طہرانی کی معروف تصنیف، کتاب الذریعہ الی تصانیف الشیعہ کے مشمولات یوں نقل ہوئے ہیں:

"Agha Buzrug Tahrim, Al-Zari ah ila Tasrif al-Shiah,..."

☆☆☆☆☆